Date of Publication : 09-12-2014

PRICE Rs. 3/-

POSTED AT N.D.P.S.O, New Delhi-01
ON 10-11 Dec. 2014R.N.I No. 2186/57

POSTAL REGN. NO. DL (C) -01/1195/2012-14
Licensed to Post Without PrepaymentU (C) 160/2012-14

HAMARI ZABAN (WEEKLY)

ہفت روزہ

ہماری زبان

انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی

15-21 December 2014
Issue: 47, Vol.:73

۱۵تا۲۱ دسمبر ۲۰۱۴ء
شمارہ نمبر: ۴۷، جلد نمبر: ۷۳

اُردو تعلیم

اردو کی نئی بستیوں کے اسکولی نظام میں

اطہر فاروقی

جامعہ اردو علی گڑھ 1997 کے بعد ایسے عجیب و غریب حالات سے گزری جو غیر معمولی افسانوں میں ہی نظر آتے ہیں۔ یہ تاریک دور مرحوم انور سعید کے ادارے سے اخراج کے بعد ہی ختم ہوا۔ میں انور سعید کے دور سیادت کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا مگر جامعہ اردو کے ان حالات سے گزرنے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ انور سعید صاحب ہر اس تجویز کو قبول کرلیتے تھے، جس میں ذرا بھی معقولیت پنہاں ہو۔ وہ اس قدر معصوم تھے کہ جب محمود الرحمن صاحب کے شیخ الجامعہ کے عہدے کی مدت ختم ہونے کو آئی تو انور سعید صاحب کے مصاحبین نے انھیں یقین دلادیا کہ وہ انھیں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا شیخ الجامعہ بنوادیں گے۔ مرحوم نے اس بات پر نہ صرف یقین کرلیا بلکہ مصاحبین کے کہنے پر ایک ٹی وی چینل کے لیے انٹرویو تک ریکارڈ کرادیا جس میں انھوں نے تفصیل سے بتایا تھا کہ شیخ الجامعہ بننے کے بعد یونیورسٹی میں کیا کیا تبدیلیاں لائیں گے۔ اس انٹرویو کے ساتھ سعید صاحب کی زندگی پر ایک فیچر بھی بنا اور یہ دونوں چیزیں ایک بڑے ٹی وی چینل پر اس وقت نشر ہوئیں جب پیڈ نیوز کی اصطلاح رائج نہیں ہوئی تھی اور لوگوں کو اس بات کا کوئی اندازہ نہ تھا کہ بڑے سے بڑے ٹی وی چینل کس حد تک بدعنوانیوں میں جکڑا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جب نئے شیخ الجامعہ کے تقرر کا عمل شروع ہوا تو کسی بھی اسٹیج پر انور سعید مرحوم کا نام زیر غور ہی نہیں آیا! جامعہ اردو میں اس وقت جو کچھ ہو رہا تھا اس سے میری پوری طرح ناواقفیت کی وجہ میری نوکری تھی۔ میں اس وقت دہلی پبلک اسکول، بلند شہر میں ایڈمنسٹریٹر تھا جہاں انور سعید صاحب بلند شہر کے کسی واقف کار کے ساتھ اپنے بیٹے کے داخلے کے سلسلے میں تشریف لائے۔ جامعہ اردو کی عظیم خدمات اور اس کے شاندار ماضی کی وجہ سے میں نے ان کے بیٹے کا داخلہ ڈی پی ایس نوئیڈا میں کرادیا۔ اس کے بعد وہ اکثر و بیشتر بلند شہر سے گزرتے تو ملاقات ہوجاتی۔ وہ جامعہ کے بارے میں جو بتاتے، اس کو سن کر مجھے محسوس ہوتا کہ وہ واقعی بڑا کام کررہے ہیں۔ اس احساس کی وجہ علی گڑھ کے حالات سے میری ناواقفیت تھی۔ میں علی گڑھ کو یوں بھی بہت کم جانتا ہوں اور مجھے ان کے مصاحبین کے وسیع تر حلقے کا بھی کوئی علم نہ تھا۔ میرے پاس وہ اکثر اپنی بیگم کے ساتھ آتے۔ ایک مرتبہ انھوں نے مجھ سے کہا کہ وہ لندن میں جامعہ اردو قائم کررہے ہیں اور جن لوگوں سے وہ رابطے میں ہیں وہ برطانیہ کے سرکردہ لوگ ہیں۔ انھوں نے مجھ سے بھی مشورہ طلب کیا۔ میں لندن کے اکثر اردو شعرا و ادبا سے ناواقف تھا مگر لندن میں اردو کے دو استادوں رالف رسل، جنھیں برطانیہ میں اردو کا باباے اردو کہا جاتا تھا اور جن کی ہندستان کے علمی حلقوں میں بھی بڑی قدر و منزلت تھی اور ڈیوڈ میتھیوز سے واقف تھا۔ میں نے انور سعید مرحوم کو ان دونوں کے نام بتادیے اور دونوں کو تعارفی خط بھی لکھ دیے۔ دونوں نے ہر طرح کی مدد کا وعدہ کیا۔ جب لندن جانے کا وقت آیا تو انور سعید نے اصرار کیا کہ میں بھی ان کے ساتھ لندن چلوں۔ میں نے ان کی تجویز قبول کرلی۔ لندن پہنچنے پر معلوم ہوا کہ وہاں جامعہ اردو کے ذمہ دار بی بی سی کے ایک مشہور اناؤنسر جو حالاں کہ ملازمت سے سبکدوش ہوچکے تھے مگر بی بی سی کے لیے مستقل کام کرتے تھے اور ان کی ایک رفیق تھیں، جو خاتون بھی اردو حلقوں میں خاصی مشہور تھیں مگر غالباً بی بی سی کی باقاعدہ ملازمت میں بھی نہیں رہیں۔

ڈیوڈ میتھیوز کی وساطت سے ہماری ملاقات برطانیہ کے محکمہ تعلیم کے سکریٹری سے ہوئی۔ یہ سن 1998 تھا اور اردو کے سیاسی حالات مغرب میں ان حالات سے بہت مختلف تھے جو 9/11 کے حادثے کے بعد ایک مذہب ذہن میں تبدیل ہوگئے۔ سکریٹری سے ملاقات کے بعد ہمیں محسوس ہوا کہ انھوں نے اپنا ہوم ورک مکمل کرلیا ہے۔ ملاقات انگریزی انداز میں نہایت خوشگوار طریقے سے شروع ہوئی اور ابتدا ہی میں انھوں نے اپنی حکومت کی طرف سے اس بات کی یقین دہانی کرائی کہ ان کی حکومت ہر شہری کو اسکول کے نظام میں اس کی زبان کی تعلیم دینے کی پابند ہے۔ انھیں اس بات کا شکوہ تھا کہ برطانیہ میں اردو داں آبادی نے اسکول کے نظام میں اردو کی شمولیت کے لیے کوئی کوشش نہیں کی اور وہ پہلی مرتبہ کسی ایک ادارے کے وفد سے مل رہے تھے، جو اردو کی تعلیم کے وسیع نیٹ ورک سے وابستہ ہونے کے باوجود دینی مدارس سے کسی طرح ملحق نہیں۔ یہ اس وقت بھی عجیب بات تھی اور آج بھی ہے کہ جامعہ اردو جیسے اہم ادارے کا دینی مدارس سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں اس کا نظام تعلیم مکمل طور پر اسکول کے نظام تعلیم کے طرز پر کام کررہا ہے۔ سکریٹری ایجوکیشن نے دوسری اہم ترین بات یہ کہی کہ برطانیہ میں آباد اردو آبادی اپنے بچوں کی اردو کی تعلیم کے حصول کے لیے اسکولوں کی جگہ دینی مدارس کا رخ کرتی ہے جہاں وہ جزوقتی طور پر مذہبی تعلیم کے ساتھ اردو کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ یہ بچے لازماً اسکول کے نظام تعلیم کا حصہ ہوتے ہیں اور دونوں نظاموں کے طرز تعلیم کے فرق کو محسوس کرسکتے ہیں۔ اسکول میں ان بچوں کا سابقہ ان اساتذہ سے پڑتا ہے جو تربیت یافتہ ہوتے ہیں۔ وہ بچوں کی نفسیات سے بخوبی واقف ہوتے ہیں جب کہ دینی مدارس کے مدرسین قدیم طرز پر انھیں تعلیم دیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دینی مدارس کے بچے بہت جلد مذہبی تعلیم کو خیرباد کہہ دیتے ہیں اور اس طرح ان کی اردو کی تعلیم کا سلسلہ بھی منقطع ہوجاتا

ہے۔ سکریٹری ایجوکیشن نے برطانیہ کے سیاق و سباق میں سب سے اہم بات یہ بتائی کہ برطانیہ میں خصوصاً پاکستان سے منتقل ہونے والی اردو داں آبادی کی پہلی دوسری اور تیسری نسل ان لوگوں کی تھی جو مزدور کی حیثیت سے برطانیہ آتے تھے اور ان کے ذہن میں ثقافت اور تہذیب کے تناظر میں زبانوں کے رول کا کوئی تصور نہ تھا۔ ان لوگوں کے بچے جب تعلیم کے لیے برطانوی اسکولوں میں گئے اور وہاں انھوں نے انگریزی بولنی سیکھی تو ان کے والدین نے اسے اپنے لیے نہایت فخر کی بات جانا اور کبھی انھیں اپنی زبانیں سیکھنے کی طرف راغب نہ کیا اور گھر میں والدین بھی ان بچوں کے ساتھ ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں بات کرنے لگے۔ لہٰذا جب یہ بچے سن بلوغت کو پہنچے تو یہ انگریزی کے سوا اور کسی زبان سے واقف نہ تھے، جو برطانوی حکومت کے لیے باعث تشویش تھا کیوں کہ اس طرح برطانیہ میں آباد ایک بڑا طبقہ اپنی ثقافت سے ناواقف ہوجاتا اور برطانوی ثقافت کی رنگارنگی ماند پڑ جاتی، اس لیے، برطانوی حکومت نے اردو ثقافت کے لیے ہر طرح کی سہولتیں بہم پہنچائیں۔ سکریٹری ایجوکیشن نے جامعہ اردو کی برطانوی شاخ کی کوشش کو نہایت مستحسن قدم قرار دیا اور کہا کہ جامعہ اردو ایک پروجیکٹ تیار کرے، جس میں وہ برطانیہ میں اسکولوں میں تعلیم کی ذمہ داری نیز جز وقتی اور شبینہ اسکول کے قیام کی ذمہ داری بھی قبول کرے۔ حکومت برطانیہ اس پروجیکٹ پر آنے والے تمام اخراجات برداشت کرے گی اور جامعہ اردو برطانیہ میں اردو کے فروغ کے لیے کام کرنے والی ایسی رضاکار تنظیم ہوگی جو اردو تعلیم کے ذیل میں برطانیہ کی Authorized Agency کا رول ادا کرے گی۔

یورپ میں عموماً اور برطانیہ میں خصوصاً امیگریشن (Immigration) ساتویں دہے کے آخر تک آسان تھا، وسط میں تو بالکل مشکل نہ تھی پھر کسی ایک معین تاریخ کے بعد جو غالباً 1978 کے بعد کا کوئی دن تھا، برطانیہ میں امیگریشن قوانین سخت کردیے گئے اور پھر سخت سے سخت تر ہونے کا یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ ہندستان، پاکستان اور بنگلہ دیش سے ساتویں دہے کے آخر تک بڑی تعداد میں وہ لوگ برطانیہ گئے جو مختلف قسم کے مزدور تھے۔ ان تینوں ہی ممالک میں آٹھویں دہے تک معیاری اعلا تعلیم بالعموم ماضی کے ان مقتدر و متمول خاندانوں کا مقدر تھی جو محکوم ہندستان کے زمانے میں تعلیم کے لیے برطانیہ جاتے تھے۔ بلاشبہ آزادی کے بعد اعلا معیاری تعلیم کے دائرے میں شامل ہونے والوں کی تعداد ہند و پاک میں خصوصاً بڑھی مگر برطانیہ جانے والوں میں پاکستانی فیوڈل طبقے کے نوجوانوں کا تناسب ہندستان کے مقابلے میں زیادہ تھا۔ آزادی کے بعد ہندستان سے مسلم اشرافیہ کا ایک مخصوص طبقہ ہجرت کرکے یہاں برطانیہ گیا۔ یہ طبقہ ان لوگوں کا تھا جنھوں نے پاکستان کے قیام کی حمایت نہ کی تھی مگر تقسیم ہندستان کے بعد وہ مجبور محض ہو کر رہ گئے۔ ان لوگوں کو پاکستان کا قیام قابل قبول نہ تھا اور ہندستان میں مسلمانوں کی جو مجموعی حالت تھی اس میں یہ ہندستان میں بھی نہ رہ سکتے تھے اس لیے برطانیہ چلے گئے۔ اس ذیل میں ایک اہم نام عطیہ حسین کا ہے جن کا شاہ کار ناول Sunlight on a Broken Column جس کا نہایت عمدہ اردو ترجمہ انتظار حسین نے 'شکستہ ستون پر دھوپ' کے عنوان سے کیا ہے۔ عطیہ حسین کے تہذیبی حلقے میں اردو جزو لاینفک کی حیثیت رکھتی تھی مگر انھوں نے قرۃ العین حیدر کے برعکس انگریزی کو اپنی واحد تخلیقی زبان کے طور پر اختیار کیا۔ وہ آخری وقت تک برطانیہ میں ہی رہیں جہاں وہ بی بی سی سے وابستہ تھیں مگر وہاں بھی ان کا تعلق اردو نشریات سے نہ تھا۔ عطیہ حسین کی شادی لکھنؤ کے مشہور حبیب اللہ خاندان میں ہوئی۔ اس خاندان کے جن لوگوں نے ہندستان میں رہنے کو ترجیح دی وہ یہاں بھی محترم و مقتدر ٹھہرے۔ عطیہ حسین کی شادی بعد میں ٹوٹ گئی۔ تقسیم کا طوفان قرۃ العین حیدر کو بھی پاکستان لے گیا جہاں سے وہ بھی برطانیہ چلی گئیں اور پھر مولانا آزاد کی وساطت سے ان کے ہندستان آنے کی راہ ہموار ہوئی۔ اس سے پہلے بھی Twilight in Delhi کے مصنف۔۔۔ اس ناول کا بے حد عمدہ اردو ترجمہ احمد علی کی بیگم کے نام سے شائع ہوا ہے مگر اردو ادبی حلقوں میں اس امر پر اتفاق ہے کہ وہ احمد علی کا کیا ہوا ہے۔۔۔ اردو میں ناول کو پڑھ کر لگتا ہے کہ انگریزی قالب اردو سے ترجمہ کیا گیا ہے اور انگریزی میں ناول کو اگر پہلے پڑھ لیا جائے تو اردو قالب اس کا ترجمہ محض معلوم ہوتا ہے۔۔۔ اور قرآن کے ایک ازحد محترم مترجم احمد علی کے ساتھ ہوا۔ وہ ہندستان کے چینی سفارت خانے میں برسر کار تھے کہ ایک دن اچانک انھیں مسلمان ہونے کی نسبت سے ایک جہاز پر سوار کرادیا گیا جس نے انھیں زبردستی کراچی اتار دیا۔

اس طرح برطانیہ میں اردو جاننے یا اردو میں لکھنے والوں اور اردو کی محفلوں میں شامل ہونے والے دو طبقات تھے۔ ایک طبقۂ اشراف کے لوگ اور دوسرے مزدوروں یا نچلے طبقے کے وہ لوگ جن میں تخلیقی صلاحیتیں تھیں۔ موخرالذکر میں اکثریت شاعروں کی تھی جب کہ اول الذکر میں جو اہل قلم شامل تھے وہ افسانہ نگار اور ناول نویس بھی تھے جن میں اہم ترین نام عبداللہ حسین کا ہے۔ تقسیم پر حسین کا شاہ کار ناول 'اداس نسلیں' جلد ہی کلاسک کی شکل اختیار کرگیا۔ عبداللہ حسین انگریزی میں بھی لکھتے ہیں اور خود ہی اپنی تحریروں کا اردو سے انگریزی میں ترجمہ کرتے ہیں۔ برطانیہ کے طبقۂ اشراف کی ان محفلوں میں فیض احمد فیض بھی اکثر و بیشتر اس لیے شامل ہوجاتے کہ ان کا بہت سا وقت لندن میں ہی گزرتا۔ جنرل ضیاء الحق کے اقتدار میں آنے کے کچھ روز بعد احمد فراز نے بھی خود اختیار کردہ جلاوطنی کے بعد لندن ہی کی راہ لی تھی۔ برطانیہ میں آباد اردو اہل قلم کے ان دو طبقات دریا کے ان کناروں کی طرح تھے جو کبھی نہیں ملے۔ برطانیہ میں آباد عاشور کاظمی نے انجمن ترقی پسند مصنفین کے پچاس سال مکمل ہونے کے موقعے پر ایک عالی شان بین الاقوامی کانفرنس لندن میں منعقد کی تھی جس میں برطانیہ میں موجود اشرافیہ طبقے کا کوئی مصنف شریک نہیں ہوا۔ لطف یہ ہے کہ انھیں اس لیے مدعو ہی نہیں کیا گیا کہ عاشور کاظمی ان سے واقف ہی نہیں تھے۔ 1993 میں اپنے سفر لندن کے موقعے پر میری ملاقات عاشور کاظمی سے ہوئی تو انھوں نے بتایا کہ وہ ایشیا کے ان تمام مصنفین کی ایک ڈائرکٹری مرتب کررہے ہیں جو کبھی بھی برطانیہ میں قیام پذیر رہے ہوں۔ میں نے ان سے درخواست کی کہ کیا وہ مجھے عطیہ حسین کا ٹیلی فون نمبر بتا سکتے ہیں؟ اس پر عاشور صاحب نے حقارت آمیز تعجب سے پوچھا: "یہ کون بزرگ ہیں؟"

انٹرنیٹ کے اس دور میں جب اردو کے ادبی جرائد کلی طور پر نہ سہی مگر ان کے مندرجات جزوی طور پر سوشل میڈیا پر دستیاب ہونے لگے ہیں، ان ادبی جرائد کے لیے ضروری ہے کہ وہ ہندستان ہی نہیں اردو کی نئی بستیوں میں اردو تعلیم کے موضوع پر تحریریں شائع کریں، جس طرح ہندستان میں اردو کے ہمہ جہتی فروغ کے لیے اسکولوں کے نظام میں اردو کی شمولیت ضروری ہے اسی طرح خصوصاً مغربی ممالک اور ان میں بھی ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور برطانیہ میں بھی اسکولوں کے نظام میں شمولیت کے بغیر اردو کا فروغ ممکن نہیں۔

وہ یقینی طور پر عطیہ حسین سے واقف نہ تھے۔ ان کا کوئی قریبی واسطہ لندن یونی ورسٹی میں اردو تدریس سے وابستہ اساتذہ سے بھی نہ تھا جب کہ برطانیہ کے اسکولوں میں اردو کی تدریسی پالیسیاں بھی وضع کرتے تھے۔ رالف رسل نے اپنے بے حد عمدہ مضمون Urdu in India میں برطانیہ کے اسکولوں میں اردو کی صورت حال اور درپیش مسائل کا تفصیل سے (1998) تجزیہ کیا ہے جو اردو تعلیم کے سیاق میں نہایت اہم تحریر ہے۔

برطانیہ میں اور برطانیہ کی طرح دوسرے مغربی ممالک خصوصاً امریکہ میں اردو کی صورت حال یکساں ہے۔ اردو کے وہ مصنفین خصوصاً شعرا جو مزدور یا نچلے طبقات کی حیثیت سے وہاں رہے ان کے لیے اردو کا مطلب اردو کی ادبی بلکہ یوں کہیے کہ شعری محفلیں تھا جن میں یونی ورسٹی اساتذہ شاذ و نادر ہی شرکت کرتے تھے۔ امریکہ کی دانش گاہوں میں اردو۔۔۔ جو بالعموم ساؤتھ ایشین ثقافت کے شعبوں سے وابستہ ہیں یوں ان کی نظر تہذیب یا ثقافت پر بھی ہوتی ہے۔۔۔ کے اساتذہ کی خاصی بڑی تعداد ہے اور ان کی علمی فتوحات بھی برطانیہ میں اردو کے اساتذہ۔۔۔ جو غالباً لندن یونی ورسٹی کے علاوہ اور کہیں نہیں ہیں اور لندن یونی ورسٹی میں بھی ان کی تعداد بھی پانچ سے زیادہ نہیں رہی، آج کل غالباً یہ تعداد تین ہے۔۔۔ سے کہیں زیادہ ہیں۔ دونوں کے درمیان 'کلاس' کا فرق واضح ہے۔ کلاس کا اردو ترجمہ "طبقہ" ہے مگر کلاس طبقات کی وضاحتوں کی پوری طرح تشریح نہیں کرتا۔ طبقات کا استعمال ہمارے یہاں کلاس کے سیاق و سباق میں کبھی اس لیے بھی نہیں ہوا کیوں کہ ابھی ہمارے یہاں طبقاتی کشمکش کی بدصورتی پوری طرح نمایاں نہیں ہوئی ہے۔

ہندستان کے ادبی رسائل نے گزشتہ پندرہ بیس برسوں میں اردو کی نئی بستیوں میں اردو کی گردان کو دکان داری کا کامیاب نسخہ بنالیا۔ ان رسائل نے جن لوگوں کی تخلیقات شائع کیں ان میں اکثریت ان ہی لوگوں کی تھی جو پہلی، دوسری اور تیسری نسل کے طور پر مغربی ممالک میں مزدور کی حیثیت سے گئے تھے اور معمولی درجے کے شاعر یا افسانہ نگار وغیرہ تھے اور جنھیں ثقافت کے عناصر اور اس میں زبان کے رول کا کوئی عرفان نہ تھا اور چوں کہ ہندستان کے ادبی رسائل بھی ادب میں زبان کے رول اور زبان کے فروغ کے معاملات سے مکمل طور پر بے خبر ہیں، اس لیے، ان کی تحریروں سے اردو کی نئی بستیوں کے قاری بھی رہ نمائی حاصل نہ کرسکے۔

انٹرنیٹ کے اس دور میں جب اردو کے ادبی جرائد کلی طور پر نہ سہی مگر ان کے مندرجات جزوی طور پر سوشل میڈیا پر دستیاب ہونے لگے ہیں، ان ادبی جرائد کے لیے ضروری ہے کہ وہ ہندستان ہی نہیں اردو کی نئی بستیوں میں اردو تعلیم کے موضوع پر تحریریں شائع کریں، جس طرح ہندستان میں اردو کے ہمہ جہتی فروغ کے لیے اسکولوں کے نظام میں اردو کی شمولیت ضروری ہے اسی طرح خصوصاً مغربی ممالک اور ان میں بھی ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور برطانیہ میں بھی اسکولوں کے نظام میں شمولیت کے بغیر اردو کا فروغ ممکن نہیں۔

●●●

دوسری اور آخری قسط

حالی اور شبلی کی خوش ذوقی اور ظرافت پسندی

اسیم کاویانی (فلیٹ نمبر 702، گیتن اپارٹمنٹ، بیلویدرے روڈ، مجگاؤں، ممبئی 400010)
E-mail: aseemkavyani@gmail.com

حالی و شبلی دونوں ہی ایک دوسرے سے محبت و اخلاص رکھتے تھے اور ایک دوسرے کی رایوں اور مشوروں کی قدر کرتے تھے۔ اگر شبلی کو کوئی چشمک تھی تو وہ حالی سے نہیں، حالی کے ممدوح سرسید سے تھی۔

مولانا شبلی نے سید سلیمان ندوی کو بتایا تھا کہ جب جاحظ کی کتاب 'البیان والتبیین' نئی نئی چھپ کر آئی تو وہ انھیں انتہائی بے ترتیب و پراگندہ معلوم ہوئی۔ رات کو مولانا حالی آئے اور وہ کتاب مانگ کر لے گئے۔ صبح کو واپس کی تو فرمایا: "یہ تو نثر کا حماسہ ہے۔" بقول شبلی اُن کے اس فقرے نے کتاب کے موضوع کو اُن کے سامنے آئینہ کر دیا اور اس کی ترتیب کا وہ پہلو اُن کے سامنے آگیا جو پہلے واضح نہ ہوا تھا۔ انھوں نے یہ بھی اعتراف کیا کہ جب تک کافی مواد و تحریر موجود نہ ہو، وہ ایک قدم بھی نہیں چل سکتے، مگر حالی کی نکتہ آفرینی اس کی محتاج نہیں۔ اُن کی دقیقہ رس اور نکتہ سنج طبیعت ایسی جگہ سے مطلب نکال لیتی ہے جہاں ذہن بھی منتقل نہیں ہوتا اور یہ کمال اجتہاد کی دلیل ہے۔

مولانا حالی، مولانا شبلی کی تصنیفات کو شوق سے منگواتے تھے اور انھیں وکٹوریہ میموریل لائبریری (پانی پت) میں رکھتے تھے، جو انھوں نے اہل شہر کے چندے سے قائم کی تھی۔ ایک بار مولانا کی چند کتابیں لائبریری کے لیے منگوائیں اور انھیں لکھا کہ "گو تو آنکھوں سے معذور ہوں لیکن دوسروں کے لیے منگوائی ہیں۔"

قہر چوں ہو خود پیشہ کند والی،

ایک بار کافی دنوں بعد مولانا شبلی نے مولانا حالی کو خط لکھا اور خالی اُن کے تغافل کی شکایت کی۔ حالی نے انھیں جواب تحریر کیا:

"ایک مدت کے بعد عنایت نامے کے ورود نے میری آنکھوں کے ساتھ وہی کام کیا جو پیراہن یوسف نے چشم یعقوب کے ساتھ کیا تھا۔ میری کوتاہ قلمی سے اگر آپ یہ سمجھے ہوں تو کچھ تعجب نہیں کہ میں آپ کے حقوق محبت کو بھول گیا ہوں۔ مگر مولانا یہ تغافل اسی قسم کا ہے جس کی نسبت کہا گیا ہے:

تغافلے کہ کم از صد نگاہ حسرت نیست

مولانا شبلی کو اپنے رفقا میں مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا شروانی اور ایم مہدی حسن سے خاص ذہنی قربت رہی تھی۔ ایک بار انھیں مولانا آزاد کے اجمیر جانے کی خبر ملی تو اپنے خط میں یوں دریافت کرتے ہیں:

"...اجمیر کب تک جایئے گا؟ جغرافیہ تو اس قدر ضرور معلوم ہوگا کہ اس راہ میں لکھنؤ بھی آتا ہے!"

مولانا شروانی سے منقول ہے کہ حادثہ لنگ پا کے بعد کے زمانے میں ایک بار مولانا شبلی علی گڑھ کالج میں لکچر کے لیے مدعو کیے گئے، کافی تاخیر سے پہنچے۔ تاخیر کا عذر بیان کرکے فرمایا: "یہ عذر عذر لنگ نہ خیال فرمایا جائے۔" وہ ملاقاتیوں سے گھبراتے تھے۔ بمبئی انھیں اس بنا پر بھی پسند تھا کہ یہاں کوئی اُن کی خلوت گزینی میں مخل نہ ہوسکتا تھا۔ بمبئی سے ایم مہدی حسن کو انھوں نے ایک بار لکھا تھا "یہاں شبلی پڑا پھرتا ہے اور کوئی جانتا بھی نہیں کہ یہ شبلی ہے۔"

پھلوں میں مولانا شبلی کو نارنگیاں کافی پسند تھیں اور اناناس ناپسند تھا۔ اُن کے ایک عزیز شاگرد نے شاید انھیں اناناس بھیجا تھا یا بھیجنے کا عندیہ ظاہر کیا تھا، جس کے جواب میں انھوں نے لکھا:

"ہاں مجھ کو نارنگیاں بہت پسند ہیں، لیکن تمھاری تکلیف کے لحاظ سے بھی تکلیف نہیں دی۔ میں آدمی تو ہوں، مگر 'اناناس' کو پسند نہیں کرتا۔" ('اناناس' کو بطرز 'انا ناس' لکھا ہے، جس کے معنی ہیں 'میں آدمی ہوں')

حالی نے 'یادگار غالب' میں ذکر کیا ہے کہ ایک دن غروب آفتاب سے قبل غالب شام کا کھانا کھا رہے تھے اور کھانے میں صرف شامی کباب تھے۔ حالی بھی اُن کی خدمت میں حاضر تھے اور اُن کے سامنے بیٹھے رومال سے مکھیاں جھل رہے تھے۔ غالب نے اُن کی سعادت مندی کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا: "آپ ناحق تکلیف فرماتے ہیں۔ میں ان کبابوں میں سے آپ کو کچھ دوں گا نہیں۔"

گو کہ مولانا شبلی کو ایک صوفی کا نام عطا ہوا تھا، لیکن انھوں نے دل ایک عاشق کا پایا تھا اور طبیعت میں نخوت و افتخار پسندی شامل تھی۔ حالی کی سپاٹ زندگی کو نہ تو کسی عطیہ فیضی کے سے تعلق کی شگفتگی و شادمانی حاصل ہوئی اور نہ ہی انھیں کبھی حریفان ندوہ کی سی شورش و شاطری کا سامنا کرنا پڑا۔ شبلی کی زندگی میں عشق و حریفائی (اب وہ حریفائی چاہے سرسید کی ہو یا حریفان ندوہ کی) نے ایک جرأت و دل کشی بھر دی تھی، یہی وجہ ہے کہ اُن کے مکاتیب میں جا بجا اُن کی زندہ دلی اور مکتوب الیہ سے تعلق کی سرشاری چھلکتی ہے، جب کہ حالی کی مکتوب نویسی بے کیف اور ادائے فرض کے احساس سے بوجھل ہے۔

اب تو ندوے کے بندگان عالی بھی با دل ناخواستہ سہی عطیہ و شبلی کے قصے کو تسلیم کرتے ہیں۔ دراصل اپنے قریبی احباب کو لکھے شبلی کے کئی خطوط نے کبھی بھی راز نہ رکھا تھا۔ مولانا شروانی کو لکھے ایک خط میں انھوں نے اپنے نظریۂ زندگی کا یوں اظہار کیا تھا کہ 'عشق مجازی عشق حقیقی کا پل ہے۔' اور ان ہی کو لکھے ایک اور خط میں اپنے عاشقانہ مزاج کا یوں اعلان کیا تھا کہ 'لوگ اکبری یا عالم گیری ہوتے ہیں، لیکن میں جہاں گیری ہوں۔' رہے عطیہ کے نام لکھے خطوط، تو اُن کے اسلوب میں جو لطافت اور زندگی کی حرارت ہے وہ اُن کی دوسری تحریروں میں نہیں ملتی۔ جب عطیہ نے انھیں بنا اطلاع دیے ایک یہودی بیہوکن رحمین سے شادی کرلی تھی تو انھوں نے ایم مہدی حسن کو لکھے ہوئے ایک خط میں اپنے دل کا درد انڈیلتے ہوئے بھی تحریر کی لطافت کو ہاتھ سے نہ جانے دیا تھا:

"قرآن پاک میں یہودی ذلیل و خوار بتائے گئے ہیں لیکن کیا ۲ دسمبر 1912 کے بعد بھی! جس دن عطیہ ایک یہودی کو ہاتھ آئی۔ مشہور کیا گیا ہے کہ وہ مسلمان ہوگیا، اس لیے تو نہیں کہ:

میں ہوا کافر تو وہ کافر مسلمان ہوگیا"

معاملات دل کی گفتگو میں اکثر اُن کا یہی انداز نظر آتا ہے۔

ایم مہدی حسن نے مولانا شبلی کو اپنے عقد ثانی کی اطلاع دیتے ہوئے لکھا تھا کہ مدت کے بعد وہ حسن لطیف ہاتھ آئی ہے جو آپ لوگوں کو دوسری دنیا میں ملے گی۔ مولانا نے انھیں جواب میں لکھا۔ "آپ کے احترام حرم جدید کی داد دوں یا رشک کروں!" شبلی چاہتے تھے کہ بیگم مہدی اُن سے پردہ نہ کریں، لیکن بیگم مہدی اور مہدی حسن کو یہ منظور نہ تھا۔ ایک دوسرے خط میں بیگم مہدی کو اس انداز سے سلام بھجوایا کہ 'حرم سے گو اب تک نامحرم ہوں، لیکن ایمان بالغیب کا سلام کہہ دیجیے گا۔'

بہت کم مواقع پر فرشتہ صفت حالی 'بشریت کے یا خوے آدم کے اظہار میں کھلتے ہیں۔ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی رقم طراز ہیں کہ 1909 یا 1910 کی بات ہے، جب مولوی محمد یحییٰ تنہا نے مولانا حالی کو اپنی شادی میں پانی پت سے بلایا تھا۔ شادی کی تقریب کے بعد مولانا حالی، مولوی محمد اسماعیل میرٹھی اور چند دوسرے بزرگ آپس میں بیٹھے گفتگو کررہے تھے۔ مولوی محمد اسماعیل میرٹھی نے مسکراتے ہوئے مولوی محمد یحییٰ سے کہا "اب آپ اپنا تخلص بدل دیں، کیوں کہ اب آپ تنہا نہیں رہے۔" اس پر مولانا حالی نے فرمایا کہ "نہیں مولوی صاحب، یہ بات نہیں۔ 'تن' ہا' تو یہ ابھی ہوئے ہیں۔" احباب مولانا کی جودت طبع اور شگفتہ مزاجی پر مچل اٹھے تھے۔

یہ اُن کی اپنی اپنی شخصیت اور پرورش کا فرق ہے کہ حالی نے دلی میں اپنے پہلی بار کے ڈیڑھ برس کے قیام میں (جامع) مسجد کے زیر سایہ مدرسے میں اقامت اور حصول علم ہی سے غرض رکھی تھی اور کبھی نظر اٹھا کر دلی کالج تک کو دیکھا نہیں تھا۔ جب کہ شبلی حیدرآباد میں عید کے دن داغ سے ملنے جا نکلے تھے تو داغ کے حرم سے ناگہانی طور پر چلی آئی پانزدہ (15) سالہ تازہ زمین دختر (بقول شبلی 'بہ مثل جنت الفردوس کی حور' بحوالہ کالن پوری) کے ہوش ربا نظارے کو بھی اپنی نظروں میں سمیٹ لائے تھے۔

نیک خو اور مصلح قوم حالی نے عورت میں صرف ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کو دیکھا۔ کہیں اور توجہ کی بھی تو بیوہ کی مناجات سنانے بیٹھ گئے یا پھر اپنی بیوی کی دل جوئی میں یہ لکھتے ہوئے: "کیا اچھی بات ہو کہ تم وہاں سے ایسی موٹی تازی ہو کے آؤ کہ یہاں تمھیں کوئی پہچان نہ سکے اور تم قسمیں کھا کھا کے یقین دلاؤ کہ میں وہی ہوں۔" اُن کا جام زمزم ہی سے بھرا رہا۔

کوئی شخص صحیح معنوں میں ظریف الطبع نہیں ہوسکتا اگر وہ خود کے ہدف ظرافت بنائے جانے کی سہار نہ رکھتا ہو۔ ہمارے یہ دونوں بزرگ اس سلسلے میں بڑے کشادہ ظرف واقع ہوئے تھے۔ جیسا کہ محمد داؤد عباسی کے قصے سے ظاہر ہوتا ہے۔

ایم اے او کالج کے ابتدائی عہد میں محمد داؤد عباسی وہاں کے ایک بڑے طرح دار طالب علم تھے۔ وہ نہ صرف قادر الکلام شاعر و ادیب تھے بلکہ غضب کے بذلہ

(بقیہ صفحہ ۶ پر)

اردو دنیا

27 ہزار اردو اساتذہ کی بحالی جلد ہوگی

بہار اسٹیٹ اکزامنیشن کمیٹی نے گریس مارکس کے ساتھ رزلٹ تیار کیا

گریس مارک سے تقریباً 8 ہزار امیدواروں کو فائدہ ملنے کی امید

پٹنہ (۱۸ نومبر)۔ ریاست میں 27 ہزار اردو اساتذہ کی بحالی کی کارروائی اسی مہینے شروع ہوگی۔ بہار اسٹیٹ اکزامنیشن کمیٹی نے گریس کے ساتھ ہی اسپیشل ٹی ای ٹی (اردو) کا رزلٹ تیار کرلیا ہے اور اس تعلق سے میٹنگ طلب کی گئی ہے۔ میٹنگ میں رزلٹ پر بورڈ کی مہر لگنے کے بعد کسی دن اسے جاری کردیا جائے گا اور اس کے بعد فوری طور پر محکمہ تعلیم بحالی کا شیڈول جاری کرے گا۔ محکمہ تعلیم کو امید ہے کہ اس مہینے کے آخر تک بحالی کی کارروائی شروع کردی جائے گی۔ اس بحالی کے ساتھ مڈل اسکولوں میں 400 جگہ اساتذہ کی بھی بحالی ہوگی۔ اسپیشل ٹی ای ٹی اردو پاس کرنے والے جتنے بھی امیدوار ہیں ان سبھی کی بحالی اس بار ہونے کی امید ہے۔ اس کے بعد بھی اردو اساتذہ کی کچھ جگہیں خالی رہ جائیں گی کیوں کہ اسپیشل ٹی ای ٹی (اردو) میں تقریباً 15 ہزار امیدوار کامیاب ہوئے ہیں۔ سوال نامے میں غلطیاں ہونے کی وجہ سے حکومت نے دونوں امتحان میں 10 اور 15 نمبر گریس دینے کا حکم بہار اسٹیٹ اکزامنیشن بورڈ کو دیا ہے۔ گریس کے ساتھ نئے رزلٹ سے پاس ہونے والوں کی تعداد میں سات سے آٹھ ہزار تک کا اضافہ ہوسکتا ہے۔ اس کے باوجود بھی بحالی کے بعد تقریباً پانچ ہزار اساتذہ کے عہدے خالی رہ جائیں گے۔

(انقلاب۔ دہلی)

اردو اساتذہ کی ریکارڈ سازی سے فرار حاصل کرنے کی کوشش

اردو کے طلبہ پر سنسکرت کے اساتذہ تھوپے جانے کے سوال پر وزارت نے کوئی جواب نہیں دیا

نئی دہلی (۱۶ نومبر)۔ ملک کے تعلیمی نظام میں سنسکرت کو لازمی کرنے کا منصوبہ بنا رہی وزارت برائے فروغ انسانی وسائل (ایچ آر ڈی) کو تقریباً تمام ہندوستانی زبانوں سے پیار ہے۔ اگر ناراضگی یا دکھ ہے تو صرف ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کی ضامن اردو سے ہی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ضلع انفارمیشن سے ہر ایک سرگرمی کا حساب کتاب رکھنے والی وزارت تعلیم کے پاس صرف اردو اساتذہ کا حساب کتاب نہیں ہے، جب کہ اس تعلق سے اراکین پارلیمنٹ کے ذریعے متعلقہ وزارت کو مسلسل یاد دہانی کرائی جارہی ہے۔

کل راجیہ سبھا میں اردو اساتذہ کی بحالی کے تعلق سے پوچھے گئے ایک سوال کے جواب میں وزیر مملکت برائے فروغ انسانی وسائل اپیندر کشواہا سوال کا راست جواب دینے کی بجائے مفت لازمی تعلیم قانون کے تعلق سے ہی وضاحت دیتے نظر آئے۔ انھوں نے اردو اساتذہ کی بحالی کے تعلق سے اپنی ذمہ داریوں سے پلّہ جھاڑتے ہوئے یہ کہنے کی کوشش کی کہ اردو اساتذہ کا ریکارڈ رکھنا ریاستی حکومتوں کی ذمہ داری ہے۔ مودی حکومت کے زیر اہتمام تعلیمی سطح پر سب سے اہم وزارت ایچ آر ڈی کے ذریعے اردو اساتذہ کے تعلق سے ریکارڈ سازی نہ رکھنے کا یہ معاملہ ایسے وقت میں سامنے آیا ہے جب خود مرکزی وزیر تعلیم اسمرتی ایرانی اردو کے فروغ کے دعوے بھر رہی تھیں۔ انھوں نے کچھ دن قبل ہی جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے کنونشن ہال میں منعقدہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے جلسے میں اردو کے فروغ اور ترقی کے لیے حسین سپنے دکھائے تھے۔ خاص بات یہ ہے کہ اس جلسے میں اسمرتی ایرانی نے جو کچھ بھی کہا تھا وہ وزارت کے ریکارڈ میں نہیں ہے اور نہ ہی پریس انفارمیشن بیورو نے اسے کور کیا تھا۔ آسام سے راجیہ سبھا کی رکن نازنین فاروقی کے ذریعے پارلیمنٹ میں پوچھے گئے ایک تحریری سوال کا جواب دیتے ہوئے وزیر نے بتایا کہ اردو میڈیم اسکولوں میں اردو اساتذہ کی تقرری اور تنخواہ کا مسئلہ ریاستی حکومتوں سے متعلق ہے، اس لیے مرکزی حکومت اس کا ریکارڈ نہیں رکھتی۔ اس سے قبل اسمرتی ایرانی کہہ چکی ہیں کہ سرو شکشا ابھیان سے کسی بھی اردو اسکول کا براہ راست انضمام نہیں کیا جاسکتا، کیوں کہ اس کے تحت ریاستوں کو تعلیمی امکانات بڑھانے کے لیے مدد فراہم کرائی جاتی ہے۔

وزارت نے کچھ ریاستوں میں اردو اساتذہ کی بحالی کا ادھورا ریکارڈ دیا، جیسے آندھرا پردیش، ہماچل پردیش، چھتیس گڑھ، کیرالہ، اڑیسہ وغیرہ کا، مگر وہ ریکارڈ ۲۰۰۹ سے لے کر ۲۰۱۲ تک کے ہیں، جب کہ ۲۰۱۳-۲۰۱۴ کے ریکارڈ وزارت کے پاس نہیں ہیں، صرف پنجاب کا ہے جہاں دو سال میں 23 اردو اساتذہ ہیں۔ وزارت نے نازنین فاروقی کے ایک سوال کا جواب حذف کردیا جس میں انھوں نے مسلم تنظیموں کی جانب سے لگائے گئے الزامات کے حوالے سے پوچھا تھا کہ جن اسکولوں میں مسلم بچے ہیں اور وہ اردو پڑھنا چاہتے ہیں ان پر زبردستی سنسکرت کے استاد تھوپے جارہے ہیں تاکہ انھیں سنسکرت پڑھنے پر مجبور کیا جائے۔ وزارت نے نازنین فاروقی کے اس اندیشے پر کچھ کہنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی جس پر نازنین فاروقی سخت ناراض ہیں۔

(انقلاب۔ دہلی)

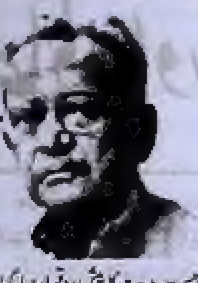
کانگریس کے اقتدار میں آنے پر اردو اساتذہ مستقل کیے جائیں گے

نئی دہلی۔ مصطفیٰ آباد اسمبلی علاقے کے کل تیرہ وارڈ مصطفیٰ آباد میں منعقد ایک جلسۂ عام سے خطاب کرتے ہوئے سابق ایم ایل اے حسن احمد نے کہا کہ اگر دہلی میں دوبارہ کانگریس کی حکومت آتی ہے تو پارٹی دہلی سرکار کے اسکولوں میں اردو کے اساتذہ کو مستقل کرنے کا کام کرے گی اور جن جگہوں پر اردو اساتذہ کی ضرورت ہوگی وہاں پر بھی اردو ٹیچرز تقرر کیے جائیں گے۔

(راشٹریہ سہارا۔ دہلی)

عصر حاضر کے ممتاز نقاد شمس الرحمن فاروقی

ڈی ایس سی ایوارڈ کے لیے آخری پانچ میں شامل



نئی دہلی (۲۹ نومبر)۔ ہندوستان کے اردو کے ممتاز محقق اور نقاد شمس الرحمن فاروقی اور ہند نژاد امریکی مصنفہ جھمپا لہری ان پانچ مصنفین میں ہیں جنھیں اگلے سال کے 50000 امریکی ڈالر والے ڈی ایس سی ساؤتھ ایشین لٹریچر پرائز کے لیے آخری پانچ امیدواروں کی فہرست میں شامل کیا گیا ہے۔ ۲۰۱۵ کے لیے ان ناموں کا اعلان لندن میں کیا گیا۔ اردو کے ممتاز نقاد، محقق، شاعر اور ناول نگار شمس الرحمن فاروقی کو آخری پانچ میں ان کے ناول 'دی مرر آف بیوٹی' کے لیے شامل کیا گیا ہے۔ واضح رہے کہ فاروقی صاحب نے تنقید نگاری سے اپنا سفر شروع کیا تھا۔ انھوں نے الٰہ آباد سے موقر رسالہ 'شب خون' کا اجرا کیا جسے جدیدیت کا پیش رو قرار دیا گیا۔ اس رسالے نے اردو مصنفوں کی دو نسلوں کی رہنمائی کی۔ شمس الرحمن فاروقی صاحب نے 'شب خون' میں کے بعد دیگرے کئی افسانے لکھے جنھیں بے حد مقبولیت حاصل ہوئی۔ شمس الرحمن فاروقی اس سے قبل ساہتیہ اکادمی ایوارڈ اور سرسوتی سمان سے سرفراز کیے جاچکے ہیں۔

(انقلاب۔ دہلی)

اردو پڑھنے والے طلبہ کی بڑی تعداد اردو کی تعلیم سے محروم

علی گڑھ (۲۹ نومبر)۔ شمس مسلم ایجوکیشنل ویلفیئر سوسائٹی کے صدر کنور نسیم شاہد نے کہا ہے کہ ضلع بھر میں اردو پڑھنے والے طلبہ کی بڑی تعداد اردو کی تعلیم سے محروم ہے۔ ضلع کے حسب افسران کی غلط پالیسیوں کی وجہ سے اردو اساتذہ کا ایسے اسکولوں میں تقرر کیا گیا ہے جہاں اردو پڑھنے والے طلبہ نہیں ہیں، جہاں اردو پڑھنے والے طلبہ کی ایک بڑی تعداد ہے وہاں اردو اساتذہ نہیں ہیں۔ گزشتہ ایک سال سے ضلع افسران غلط بیانی کرکے حکومت کے ذمہ داروں کو گمراہ کررہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ مذکورہ ناانصافی کے خلاف گزشتہ سال ۱۰ اکتوبر کو جسٹس سہیل اعجاز صدیقی (چیئرمین قومی اقلیتی تعلیمی ادارہ جات نئی دہلی) کی خدمت میں ایک عرضی داشت دی گئی تھی جس پر جسٹس موصوف نے فوری کارروائی کرتے ہوئے متعلقہ افسران کے خلاف نوٹس جاری کیا تھا، لیکن ایک سال کا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوسکا۔ کنور نسیم شاہد نے مطالبہ کیا ہے کہ متعلقہ افسران کا متعدد پیشیوں پر حاضر نہ ہونے کی صورت میں جسٹس صاحب اپنی آئینی ذمہ داریوں کا استعمال کرتے ہوئے سخت اقدام کریں۔ انھوں نے مزید کہا کہ اردو کی درسی کتابوں میں متعدد غلطیاں ہیں جن کی نشان دہی کئی مرتبہ کی جاچکی ہے لیکن ابھی بھی انھی کتابوں کی طلبہ میں تقسیم کی جارہی ہے۔ ان پر فوری روک لگائی جائے۔ کنور نسیم شاہد نے کہا کہ یوپی میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ تو دیا جاچکا ہے لیکن مقامی افسران کی لاپرواہی کی وجہ سے کسی اسکول پر ابھی تک اردو میں نام بھی نہیں لکھا گیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ مسلم آبادی کے تناسب سے مسلم بستیوں میں پرائمری جونیئر اسکول کھولے جائیں جس کے لیے کافی دن قبل ضلعی سطح پر فیصلہ لیا جاچکا ہے۔

(انقلاب۔ دہلی)

تلنگانہ میں اساتذہ کے تقرر کے لیے اقدام

حیدرآباد (یکم نومبر)۔ وزیر تعلیم جگدیش ریڈی نے کہا کہ اساتذہ کے تقرر کے سلسلے میں بہت جلد ڈی ایس سی اعلامیہ جاری کیا جائے گا۔ اخباری نمائندوں سے بات چیت کرتے ہوئے وزیر تعلیم نے کہا کہ تلنگانہ حکومت عوام کو بہتر اور معیاری تعلیم کی فراہمی کا منصوبہ رکھتی ہے۔ حکومت نے غریب مستحق افراد کے لیے KG to PG مفت تعلیم کی فراہمی کا وعدہ کیا ہے۔ سرکاری مدارس میں بنیادی سہولتوں کی فراہمی اور اساتذہ کی کمی دور کرنے پر توجہ دی جارہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اساتذہ کی خالی اسامیوں پر تقرر کا عمل جلد شروع کیا جائے گا اور ڈی ایس سی نوٹیفکیشن کی تیاریاں جاری ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ تلنگانہ میں ملک کے دیگر علاقوں کے مقابلے بہتر اور معیاری تعلیم کا انتظام ہے اور کئی نامور ادارے تلنگانہ میں موجود ہیں۔

(سیاست۔ حیدرآباد)

پرائمری اسکولوں میں اردو کی نصابی کتابیں دستیاب نہیں ہو سکیں

نصف تعلیمی سال گزرنے کے بعد بھی سرکاری اسکولوں سے اردو کی نصابی کتابیں غائب

لال گوپال گنج، الٰہ آباد (۱۸ نومبر)۔ اقلیتی طبقے کے طلبہ کو اردو زبان کی تعلیم دینے کے لیے حکومت نے قانون تو نافذ کر دیا ہے لیکن نصف تعلیمی سال گزرنے کے بعد بھی الٰہ آباد ضلع کے بیشتر پرائمری اور جونیئر اسکولوں میں اردو نصاب کی کتابیں ابھی تک دستیاب نہیں ہو سکی ہیں۔ بیسک تعلیم کے اعلا افسروں کی لاپروائی کے سبب طلبہ اپنی مادری زبان کی تعلیم حاصل کرنے سے محروم ہیں۔ صوبہ اتر پردیش میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ برقرار ہونے کے باوجود بیسک ایجوکیشن کے اعلا افسران کی مسلسل لاپروائی کے سبب الٰہ آباد ضلع کے ۲۲ بلاکوں کے بیشتر پرائمری اسکولوں میں اردو نصاب کی کتابیں آج تک دستیاب نہیں ہو سکی ہیں جب کہ گزشتہ سال ضلع کے 22 بلاکوں میں تعینات کیے گئے اردو ٹیچروں کا ایسے اسکولوں میں بڑے پیمانے پر ایڈجسٹمنٹ کیا گیا جہاں پر اردو زبان کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے اقلیتی طبقے کے طلبہ زیرِ تعلیم رہے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ گزشتہ سال اردو ٹیچروں کے ایڈجسٹمنٹ کا عمل مکمل ہونے کے بعد کچھ ہی بلاکوں میں اردو نصاب کی کتابیں مہیا کرائی گئی تھیں۔ ایک طرف تعلیمی میدان میں حکومت اتر پردیش اقلیتی طبقے کے طلبہ کے فلاح و بہبود کی باتیں کر رہی ہے تو دوسری جانب اسی کی زیرِ قیادت شعبۂ تعلیم کے اعلا افسران اپنی غیر ذمہ داری کا ثبوت پیش کر رہے ہیں۔ ضلع کے متعدد بلاکوں کے ذمہ داران کے علاوہ شعرا و ادبا نے اردو زبان کے دائرے کو محدود کرنے کی سازش رچنے والے افسران کی شدید مذمت کی ہے۔
(انقلاب۔ دہلی)

گوتم بدھ یونیورسٹی میں اردو اور دیگر شعبے بند کرنے کی تیاری

نئی دہلی (۱۹ نومبر)۔ گریٹر نوئیڈا کے تعلیمی ہب میں واقع گوتم بدھ یونیورسٹی کے اندر فیکلٹی آف ہیومنیٹیز اینڈ سوشل سائنسز کے مختلف شعبوں کے پہلے سمسٹر میں طلبہ کے کم داخلوں کو لے کر یہ فیکلٹی یونیورسٹی انتظامیہ کے دہرے رویے کا شکار ہے۔ مختلف شعبوں کے اساتذہ اور طلبہ کی طرف سے اس فیکلٹی کو بہتر بنانے اور طلبہ کے لیے سستا بنانے کی بارہا تجویز پیش کیے جانے کے باوجود یونیورسٹی انتظامیہ کوئی توجہ دینے کو تیار نہیں جس کی وجہ سے قومی راجدھانی سے مہنگی فیس دے کر اس یونیورسٹی میں ہیومنیٹیز کے طلبہ پڑھنے کو تیار نہیں ہو رہے ہیں۔ غور طلب ہے کہ یونیورسٹی کے ٹیکنیکل اور مینجمنٹ کے دیگر شعبوں میں بڑی تعداد میں طلبہ و طالبات داخلہ لے رہے ہیں جس سے بہت حد تک یونیورسٹی کو مالی اعتبار سے بہت زیادہ فائدہ ہو رہا ہے۔ خاص طور سے خود ہندی اور انگلش کا شعبہ یونیورسٹی انتظامیہ کی نظروں پر سب سے ہے کیوں کہ ہندی اور انگلش کے پہلے سمسٹر میں ایک بھی طالب علم نے داخلہ نہیں لیا ہے۔ واضح رہے کہ مذکورہ فیکلٹی کے پہلے سمسٹر کی داخلہ فیس 32 ہزار روپے ہے جو آرٹس کے طلبہ عام طور سے ادا کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ مزید برآں یونیورسٹی انتظامیہ اگلے سال سے تمام طلبہ، طالبات کے لیے ہاسٹل کو لازم کرنے کا پلان بنا رہی ہے، جس کا مطلب ہے کہ اب بغیر ہاسٹل فیس جمع کیے کسی کو داخلہ نہیں دیا جائے گا، جس کے بعد اب 32 ہزار روپے داخلہ فیس کے ساتھ 55 ہزار روپے ہاسٹل اور کھانے کی فیس ملا کر کل 87 ہزار روپے جمع کرنے ہوں گے۔ طلبہ کا کہنا ہے کہ اب اتنی مہنگی فیس کی وجہ سے داخلہ لینا مزید مشکل ہو جائے گا۔ فیکلٹی آف ہیومنیٹیز کے تمام ڈپارٹمنٹ میں پی جی کے کورسز چلائے جاتے ہیں۔ یونیورسٹی کے فیکلٹی آف ہیومنیٹیز اینڈ سوشل سائنسز میں پولیٹیکل سائنس، اکنامکس، تاریخ، سائیکولوجی، سوشل ورک، ہندی، انگلش، ماس کمیونیکیشن اور اردو کے ساتھ 9 شعبے برسرِ کار ہیں۔ اس سال تمام شعبوں کے پہلے سمسٹر میں کل 165 طلبہ و طالبات نے داخلہ لیا ہے اور اگر پوری فیکلٹی کے دونوں سال کی بات کی جائے تو طلبہ و طالبات کی تعداد کل 304 تک پہنچ جاتی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ شعبۂ اردو میں پچھلے سال صرف 9 طلبہ نے داخلہ لیا تھا جب کہ اس سال یہ تعداد 13 تک پہنچ گئی ہے۔ شعبۂ اردو کے دونوں سمسٹر میں کل 10 طلبہ و طالبات ہیں۔ فیکلٹی آف ہیومنیٹیز اینڈ سوشل سائنسز کے تئیں یونیورسٹی انتظامیہ کے رویے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یونیورسٹی اس فیکلٹی سے پوری طرح مطمئن نہیں ہے۔ طلبہ اور اساتذہ کا کہنا ہے کہ انتظامیہ کو سب کچھ معلوم ہونے کے بعد کہ مہنگی فیس کی وجہ سے یہاں داخلہ لینے کے لیے طلبہ تیار نہیں ہیں، اس کے باوجود یہاں فیس کم کرنے پر یونیورسٹی انتظامیہ راضی نہیں ہو رہی ہے۔
(انقلاب۔ دہلی)

اردو بنگلہ ٹی ای ٹی پاس امیدواروں کا بحالی نہ ہونے پر احتجاج کی دھمکی

پٹنہ (۱۷ نومبر)۔ حکومت بہار نے ۲۰۱۱ء سے کئی مرتبہ اردو بنگلہ ٹی ای ٹی پاس امیدواروں کی بحالی کا اعلان کیا اور کئی مرتبہ تاریخ اور مہینوں کا بھی اعلان کیا، اس کے باوجود ہماری بحالی نہیں ہوئی۔ یہ حکومت کی کس حکمت عملی کا حصہ ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ حکومت ہماری بحالی کو کسی نہ کسی بہانے روکنے کی کوشش کر رہی ہے۔ یہ باتیں آل بہار اردو بنگلہ اسپیشل ٹی ای ٹی کامیاب امیدوار تنظیم کے صدر عبدالباقی دشاوری نے حکومت کے ذریعے تازہ بحالی کے اعلان پر اپنے خدشات کا اظہار کرتے ہوئے کہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ حکومت کا بار بار کا اعلان ہماری بے روزگاری کا مذاق ہے۔ محکمۂ تعلیم کے سکریٹری آر کے مہاجن اور وزیرِ تعلیم برشن پٹیل کی یقین دہانی بھی مذاق ہی تھا کیوں کہ پرنسپل سکریٹری اور وزیرِ تعلیم نے ہمارے وفد سے الگ الگ میٹنگوں میں بحالی کا وعدہ کیا تھا۔ ماضی میں اس وقت کے وزیرِ تعلیم پی کے شاہی اور محکمہ کے پرنسپل سکریٹری امرجیت سنہا نے بھی کئی بار وعدہ کیا لیکن وفا نہیں ہوا۔ گزشتہ دنوں عدالتِ عظمیٰ نے 34540 ٹرینڈ اساتذہ کی بحالی کا جو حکم دیا تھا اس میں 12872 اردو کے عہدے بھی شامل تھے لیکن حکومت نے محض چند سو اردو عہدوں پر بحالی کر کے فائل بند کر دیا۔ حکومت بار بار میڈیا میں بحالی کے بیانات اس لیے دیتی ہے تاکہ ہم حکومت کے خلاف کوئی احتجاج یا مظاہرہ نہ کریں۔ اگر حکومت نے ہمیں پروانۂ بحالی نہیں دیا تو ہم پٹنہ میں ہی بھوک ہڑتال پر بیٹھ جائیں گے۔
(انقلاب۔ دہلی)

اردو ریاست کی دوسری سرکاری زبان
لیکن پرائمری اسکولوں سے دور

گورکھپور (۱۸ نومبر)۔ ریاست کے تمام پرائمری اور ہائر سکنڈری اسکولوں کے لیے اب انگریزی کی تعلیم لازمی ہوگی۔ حکومت نے محکمۂ تعلیم کے افسران کو اس کے لیے خط لکھا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ پرائمری اسکولوں میں ہندی کے ساتھ ہی انگریزی کی بھی تعلیم لازمی طور پر مہیا کرائی جائے۔ اس کے ساتھ ہی اس بات کا بھی فیصلہ کیا گیا ہے کہ جولائی کی جگہ اب تعلیمی برس اپریل مہینے سے شروع ہو کر مارچ تک چلے گا۔ واضح ہو کہ کچھ اسی طرح کا نظام سی بی ایس ای بورڈ کے تحت چلنے والے اسکولوں میں نافذ ہے۔ اب یوپی بورڈ کے بھی اسکولوں پر اس نظام کا اثر ہوگا۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ اردو زبان کو یوپی کی دوسری سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے، اس کے باوجود سماجوادی پارٹی کے دورِ اقتدار میں اردو کی زبوں حالی صاف نظر آ رہی ہے۔

اس سلسلے میں حکومت نے انگریزی کی تعلیم کو لازمی بناتے ہوئے ریاست کے تعلیمی سکریٹری کو ہدایت دی ہے اور اس کے مطابق تعلیمی سکریٹری نے ریاست کے تمام بی ایس اے کو اس پر عمل کی ہدایت دی ہے۔

حکومت کی ہدایت کے بعد محکمۂ تعلیم کے افسران کے عمل پر محبانِ اردو کو افسوس ہے کہ اس طرح کا عمل تو اردو کی تعلیم کو لے کر ہونا چاہیے تھا کیوں کہ اردو کو ریاست کی دوسری سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے۔
(راشٹریہ سہارا۔ دہلی)

اردو میڈیم اسکول ہاشم نگر گولکنڈہ، حکام کی غفلت کا شکار

حیدرآباد (۲۰ نومبر)۔ کسی بھی قوم اور ملک کی ترقی کے لیے اس کی نئی نسل کا تعلیم یافتہ ہونا ضروری ہوتا ہے اور نئی نسل اس وقت ہی تعلیم یافتہ ہو سکتی ہے جب اسے تعلیمی سہولتیں فراہم کی جائیں۔ آندھرا پردیش اور تلنگانہ میں ویسے تو ہزاروں کی تعداد میں پرائمری، اپر پرائمری اور ہائی اسکول کام کر رہے ہیں جن میں سے متعدد اسکولوں کی حالت بہتر نہیں ہے۔ شہر کے بعض مقامات پر ایسے اسکول بھی کام کر رہے ہیں جہاں طلبہ کے لیے کسی قسم کی بنیادی سہولت نہیں۔ پینے کے پانی کی عدم دستیابی ایک مسئلہ بنا ہوا ہے، حد تو یہ ہے کہ طلبہ کو بیٹھنے کے لیے فرنیچر نہیں ہے، وہ ٹوٹی پھٹی چٹائیوں پر بیٹھ کر تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ بالکل اسی طرح کی صورت حال گورنمنٹ ہائی اسکول اردو و انگلش میڈیم لنگر حوض ہاشم نگر گولکنڈہ منزل کی آر سی سی عمارت میں کام کر رہے پرائمری اسکول کی ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر ان حالات میں بچے کس طرح تعلیم حاصل کریں گے اور ترقی کے منازل طے کریں گے؟ دفتر سیاست کو جب اس اسکول کی حالتِ زار کے بارے میں طلبہ کے سرپرستوں نے واقف کرایا تب ایڈیٹر 'سیاست' جناب زاہد علی خاں کی ہدایت پر گولکنڈہ پرفیکشن سوسائٹی کے وفد نے اس کے صدر جناب عثمان بن محمد الہاجری کی قیادت میں اسکول کا دورہ کیا، بچوں سے بات کی اور طلبہ کے سرپرستوں سے تبادلۂ خیال کیا۔ انھوں نے ان طلبہ و طالبات میں روزنامہ 'سیاست' کی جانب سے خصوصی طور پر تیار کردہ ریاضی کی کتابیں بھی تقسیم کیں۔ وفد میں جناب ایم اے باسط، جناب سید کریم الدین شکیل ایڈوکیٹ، جناب محمد مراد، محمد مقبول الہاجری، محمد عنایت اور محمد جنید موجود تھے۔ جناب عثمان بن محمد الہاجری کے مطابق اس اسکول میں غریب بچے تعلیم حاصل کرتے ہیں لیکن بنیادی سہولتوں کے فقدان کے باعث دن بہ دن طلبہ کی تعداد میں کمی ہو رہی ہے۔
(سیاست۔ حیدرآباد)

رفتید ولے نہ از دلِ ما

نئی دہلی۔ اردو کے معروف شاعر ڈاکٹر غلام حسین راز ردولوی کا طویل علالت کے بعد ان کی رہائش گاہ نارتھ گھونڈہ، واقع سبھاش وہار (دہلی) میں ۹ نومبر ۲۰۱۲ء کو انتقال ہو گیا۔ وہ ۸۵ برس کے تھے۔ مرحوم کے پس ماندگان میں تین بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں۔ نمازِ جنازہ نارتھ گھونڈہ کی جامع مسجد کے امام و خطیب نے پڑھائی۔ اس موقعے پر معروف شاعر نظمی سکندرآبادی، عقیل نعمانی، محمد آصف نظر، ڈاکٹر راحت مظاہری، فرحت برنی اور معین سکندرآبادی کے علاوہ بڑی تعداد میں سیاسی و سماجی لوگ موجود تھے۔ مرحوم کی تدفین مقامی قبرستان میں عمل میں آئی۔

ادارہ 'ہماری زبان' مرحوم کے لیے مغفرت اور پس ماندگان کے لیے صبرِ جمیل کی دعا کرتا ہے۔ (ادارہ)

نئی کتابیں

تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

نام کتاب : مقالاتِ پروفیسر محمد ابراہیم ڈار
مرتب اول : ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی
مرتب ثانی : پروفیسر عبدالستار دلوی
ضخامت : ۳۰۰ صفحات
قیمت : ۳۰۰ روپے
ملنے کا پتا : انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، 92- دادا بھائی نوروجی روڈ، ممبئی 400001
تبصرہ نگار : علی احمد فاطمی

یہ کتاب پروفیسر محمد ابراہیم ڈار کے بارہ مقالات پر مشتمل ہے۔ پروفیسر ڈار یوں تو کشمیر نژاد تھے لیکن تعلیم و تربیت پنجاب میں ہوئی اور ملازمت پہلے احمد آباد کے گجرات کالج اس کے بعد اسماعیل یوسف کالج ممبئی میں ہوئی اور یہیں ملازمت کرتے ہوئے انھوں نے عربی، فارسی اور اردو میں غیر معمولی مہارت حاصل کی۔ یوں بھی یہ کالج علوم شرقیہ کے لیے دور دور تک شہرت رکھتا ہے اور اس کالج سے ایک سے ایک جید عالم، فاضل ادیب و دانش ور وابستہ رہے ہیں جن کی صحبت میں پروفیسر ابراہیم ڈار نے بہت کچھ سیکھا پڑھا لکھا۔ ایک انسان اور استاد کی حیثیت سے وہ مشہور تو ہوئے ہی، ادیب و ناقد کی حیثیت ان کے یہ مقالات طے کرتے ہیں جسے پہلے ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی نے ترتیب دیا اور اب دوسری ترتیب پروفیسر عبدالستار دلوی نے دی ہے اور جسے بڑے اہتمام سے انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ممبئی نے شائع کیا ہے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ پروفیسر ابراہیم ڈار عربی، فارسی اور اردو تینوں زبان و ادب پر یکساں قدرت رکھتے تھے چنانچہ اس کتاب میں بھی ملے جلے مضامین ہیں۔ جہاں آرا بیگم، خواجہ معین الدین چشتی، شیخ فریدالدین عطار سے لے کر گوجری زبان اور جاحظ کی حیات پر مضامین ہیں۔ درمیان میں اسپین کی اسلامی تاریخ، رقعات عالمگیر وغیرہ بھی ہیں۔ یہ سارے مضامین بے حد معلوماتی اور معروضی نوعیت کے ہیں۔ اردو شاعروں میں شبلی اور اقبال پر تین مضامین: اقبال کی وطن دوستی اور اقبال اور عربی شعرا اور حیات شبلی پر ایک نظر۔ حیات شبلی مولانا سلیمان ندوی کی کتاب ہے جس پر ڈار نے سیر حاصل تبصرہ کیا ہے اور مولانا کی بعض غلطیوں کی نشان دہی کی ہے۔ یہ ایک جرأت مندانہ مضمون ہے جس کی جتنی داد دی جائے کم ہے۔ اسی طرح رقعات عالمگیری، اقبال اور عربی شعرا بھی عمدہ مقالات ہیں جن پر تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے۔ ان مقالات کو پڑھتے ہوئے مصنف کی علمی لیاقت معروضیت اور جرأت بھی کا بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے اور یہ بھی کہ ایک وقت تھا جب ہمارے عالم، ادیب ہمہ جہتی معلومات رکھتے تھے۔ کئی زبانوں پر قدرت رکھتے تھے۔ تحقیقی جائزہ لیتے تھے اور علم کا دریا بہا دیتے تھے۔ اب مہارت کا دور ہے یعنی محدودیت کا یہ جدید طریقہ علم وسعتوں کو روکتا ہے اور انسانی ذہن کو محدود و مشروط کرتا ہے۔ ایسے میں ڈار جیسے عالم اور مصنف کے مقالات کا یہ مجموعہ مشرقی علوم کو تازہ کرتا ہے۔ مبارک باد کے مستحق ہیں پروفیسر دلوی جو بہت خاموشی سے بڑے بڑے کام کر جاتے ہیں۔

○○○

نام کتاب : کرب نارسائی
شاعرہ : شہناز شازی
ضخامت : ۱۲۶ صفحات
قیمت : ۲۰۰ روپے
ملنے کا پتا : نیو ٹاؤن پبلشرز 177/18 مائدہ منزل بانچ روڈ، کراچی-70
تبصرہ نگار : سعید اختر اعظمی
sakhtar0075@gmail.com

ویرانیِ شب، ماہِ درخشاں، درد سے بھری ہوئی تنہائی اور اکیلا وجود۔ وہ اپنی ذات کے حصار میں گم رہے یا انھیں بھول جائے، فیصلہ شازی نہیں مشکل آمیز بھی ہے۔ وہ ہستی جو قلب و اذہان پر قبضہ کر کے اسے ہی اس کی ذات سے بے دخل کر دے یقیناً مستحکم حیثیت رکھتی ہے۔ یہ محبوب شہناز شازی کو اس لیے عزیز ہے کیوں کہ وہ اس کی چاہت کی جنبش کی زینت میں مگن ہیں۔ تب انھیں ہر نظارہ ڈھلا ڈھلا سا نظر آتا ہے۔ یہ وصال لمحوں میں قربت کے گل کھلاتا ہے تو ہجر کے ایام میں اپنی انا کا احساس بھی دلاتا ہے۔

کرب نارسائی شہناز شازی کے شاخ دل پہ کھلے ہوئے درد کے گلاب کی خوشبو ہے جسے وہ حساس قاری تک پہنچانے کی خواہاں ہیں۔ چھ سال کی عمر میں والدہ کا ترین حادثے میں انتقال، آٹھ بھائی بہنوں کی ذمہ داری، 1980 میں ہارون یوسف پارک سے شادی اور کراچی سے ممبئی رخصتی، اپنوں سے دوری پر شدید ڈپریشن، اصلاحی دواخانے میں شفایابی، ایک طویل اذیت ناک مرحلہ ہے جس سے وہ قدم قدم پہ نبرد آزما رہیں۔ سلاست بیان کی تمانعت ان کی شاعری رومان کے نئے دریچوں کو کھولتی ہے:

جنوں کی راہ میں منزل نہیں ملا کرتی
دعا ہے رائیگاں اس کا سفر نہ جائے کہیں

انا کے قفل زنگ آلود
علی بابا یہ سم سم کھول لوگے؟

ذہن و دل میں منتشر کہ شدت کا ہے
جسم بیمار کر رہا ہونے کا

کرنے لگی ہے اس کی خوشی بھی گفتگو
حسنِ سکوت اور بھی شاداب ہو گیا

سماعت کا لہو رسنے لگا ہے
تری آواز کا مرہم نہیں ہے

گھر آنگن اور دیس پردیس کا ذکر بھی شہناز شازی کے یہاں نئے انداز سے ہوا ہے:

آنگن میں نہ پیپل ہے، نہ جھولا ہے، نہ سکھیاں
یہ قصر مرے خواب کی تعبیر نہیں ہے

بچے بھی کے چل دیے پردیس کو تو کیا
بستی میں بن رہے ہیں غریبوں کے گھر نئے

گھر کے سامنے دکھا چانک دشمیں لگنے لگے
لوٹ کے پردیس سے آئے تو اندازہ ہوا

حکیم محمد طارق اصلاحی، عبدالاحد ساز، انجم، امام صدیقی، ڈاکٹر شفیق اعظمی، شمع افروز کاظمی، ایڈوکیٹ زبیر اعظمی اور صوبیہ صباحی کی آرا سے مرصع مجموعے میں غزلوں کے ساتھ نظمیں بھی ہیں جن میں "ماں" ترے جانے کے بعد، اسم اعظم، اس سے پہلے کہ، وہ آنکھیں، ڈکرتے بیٹے کے نام، چھوٹی بہن کے نام، ہم، وہ کون تھا، دشت ویراں، ہمدم جاناں، شامِ غم، محبت کے تین ادوار اور ہم نے کبھی سوچا نہ تھا شامل ہیں۔ شہناز شازی کا یہ حسن حوالہ ان کی حیات سے کشید لمحات کا آئینہ دار بھی ہے جسے انھوں نے بہ طور معتبر کر دیا ہے۔

اے کربِ نارسائی کی شدت تجھے سلام
اس بے ہنر کو صاحبِ دیوان کر دیا

○○○

بقیہ: حالی اور شبلی کی... ظرافت پسندی

صفحہ ۳ سے آگے

سچ بھی تھے۔ مولانا ظفر علی خاں نے جو ان سے جونیئر تھے، اُن کے بارے میں لکھا تھا کہ 'مبدائے فیاض سے ایک خاص ذوق مرحمت ہوا تھا۔ شعر فی البدیہہ کہتے تھے اور ظرافت تو مرحوم کا خاص حصہ تھی۔' مولانا محمد علی کے بقول 'داؤد اگرچہ پرانی روش کے اور بزرگانہ وضع کے طالب علم تھے، لیکن وہی اپنے وقت میں طلبہ کی سب سے ممتاز جماعت کے سردار بھی تھے۔' مولانا حالی کی ایک مشہور غزل ہے:

ان کے جاتے ہی کیا ہو گئی گھر کی صورت
نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت

اور اس غزل کا مقطع ہے:

ان کو حالی بھی بلاتے ہیں گھر اپنے مہماں
دیکھنا آپ کی اور آپ کے گھر کی صورت

داؤد صاحب ان دنوں اپنی تعلیم ختم کر کے علی گڑھ کالجیٹ اسکول میں ٹیچر لگے ہوئے تھے۔ انھوں نے مولانا حالی کے مقطع کی ایسی شوخ تضمین کی کہ ان کے مقطع کا معنی ہی بدل گیا، ذرا ملاحظہ کیجیے:

گر کرے قصد کسی کام کا دل میں انساں
پہلے یہ دیکھے وہ اس کام کے ہے بھی شایاں
سن کے لوگوں سے کہ وہ آتے تھے داؤد کے یہاں
ان کو حالی بھی بلاتے ہیں گھر اپنے مہماں
دیکھنا آپ کی اور آپ کے گھر کی صورت

حالی نے یہ تضمین سنی تو بڑی خوش ظرفی کا اظہار کیا۔ وہ جب علی گڑھ آئے تو داؤد کو ملاقات کے لیے بلایا۔ اُن کی تضمین کی بے انتہا تعریف کی اور اپنے دیوان کی درجۂ اول کی ایک جلد تحفتاً عنایت کی۔

مولانا حالی ہی پر موقوف نہیں داؤد صاحب نے مولانا شبلی کو بھی نہیں بخشا تھا۔ مولانا محمد علی سے مرقوم ہے کہ علی گڑھ کالج میں ایک خاص مدت کے لیے ہر نسل میں ایک طالب علم کو 'بوم' کا لقب عطا ہوتا تھا۔ ایک بار اس نسل کا 'بوم' مولانا شبلی کا شیدائی نکلا۔ جب کالج کا گروپ فوٹو کھینچا جانے لگا تو حضرت بوم فوراً مولانا شبلی کی کرسی کے پیچھے جا کر کھڑے ہو گئے۔ جب وہ گروپ فوٹو داؤد صاحب کے ہاتھوں میں آیا تو اسے دیکھ کر انھوں نے فی البدیہہ ارشاد کیا:

آج کالج میں عجب رنگ ہے دھوم
طلبہ کا ہے ہر طرف سے ہجوم
بول اٹھی روح سعدی مرحوم
کس نہ آید بزیر سایۂ بوم
فدا مولانا شبلی مخدوم

یہ دیکھنے کی بات ہے کہ اپنے طبعی اضمحلال اور عوارض کی سختی کے عالم میں بھی ایک سنجیدہ ادیب اپنی شائستہ مذاقی کا دامن کس طرح تھامے رہتا ہے۔ اس تعلق سے دونوں بزرگوں کے ذیل کے واقعات ان کی شائستہ مذاقی کے شاہد ہیں۔ اگر کچھ فرق ہے تو ان کی شخصیت کا فرق ہے۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ حالی اپنی عمر کے تقریباً چوہترویں سال کے پڑاؤ پر تھے۔

1899 میں ایک بار مولانا شبلی سخت علیل ہو گئے تھے۔ اُن کے دوست مولانا حبیب الرحمان شروانی نے ان کی عیادت کے لیے اعظم گڑھ آنے کا ارادہ ظاہر کیا تو مولانا شبلی نے انھیں جو خط لکھا، اس کے لفظ لفظ سے ان کی دلی مسرت جھلکی پڑتی ہے:

''کیا واقعی آپ یہاں جلوہ فرما ہوں گے اور کیا در حقیقت
یہ ہے ویرانے میں ہونے کی [illegible] چاندنی
مصرعۂ بالا کو بار بار پڑھتا ہوں اور اس سے مخاطب ہو کر کہتا ہوں
ع کیا یہ حرف ان ہی کے گھر کے ہیں!''

بیگم صالحہ عابد حسین نے لکھا ہے کہ غالباً 1911 میں جب مولانا حالی پر جب ضعیفی و کمزوری کئی امراض کا نشانہ بنے ہوئے تھے اور بصارت سے تقریباً محروم ہو چکے تھے، مولوی عبدالحق نے انھیں اپنے جلد ہی آنے کی اطلاع دی۔ حالی نے جواباً انھیں اپنی اُن دنوں کی حالت اور زندگی سے مایوسی کی کیفیت کو بڑے ہی حزنیہ انداز میں مگر حسنِ اسلوب سے تحریر کیا تھا:

''آپ نے بہت جلد تشریف لانے کا وعدہ کیا ہے، مگر میں اپنی حالت کے لحاظ سے کسی کا یہ شعر پڑھتا ہوں:
خدا ہی جانے سحر ہوتے ہو، جیتی نہ بچیں
شب فراق کی احتمال رکھتی ہے
میں اپنی طرف سے تو اُس وقت تک زندہ رہنے کے لیے بہت کوشش کروں گا۔''

سید افتخار عالم مارہروی، مولانا شبلی کی سوانح حیات لکھنا چاہتے تھے، لیکن مولانا نے انھیں منع کر دیا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ مارہروی کی لکھی ہوئی ڈپٹی نذیر احمد کی سوانح عمری 'حیات النذیر' انھیں پسند نہ آئی تھی۔ چند برس بعد (1914 میں) افتخار عالم دوبارہ رجوع ہوئے۔ مولانا شبلی نے انھیں باز رکھنے کے لیے یہ لطائف حیل یوں لکھا: ''میری لائف میرے بعد لکھیے گا، ورنہ مکمل کیوں کر ہوگی؟'' شومیٔ قسمت، اسی برس اُن کی کتابِ زندگی تمام ہوئی۔

مصادر:

(1) 'یادگارِ حالی' (صالحہ عابد حسین)
(2) 'تذکرۂ حالی' (شیخ محمد اسماعیل پانی پتی)
(3) 'حالی بہ حیثیت شاعر' (شجاعت علی سندیلوی)
(4) 'یادِ ایام' (عبدالرزاق کان پوری)
(5) 'مکاتیبِ شبلی'
(6) 'مکاتیبِ مہدی' (بیگم مہدی)
(7) 'مطائباتِ شبلی' (مولانا جالب مظاہری)
(8) مقالہ 'علی گڑھ کے دورِ اولین کی ایک عجیب و غریب شخصیت شاعر و ادیب محمد داؤد عباسی مرحوم' (سید محمود فاروقی) 'نگار' لکھنؤ، جون 1950
(9) 'مکاتیبِ حالی' (نادر) (شیخ محمد اسماعیل پانی پتی)
(10) مقالاتِ حالی (حصہ اول)
(11) موازنۂ انیس و دبیر ---- وغیرہ۔

●●●

بقیہ: مولانا آزاد: ایک عظیم رہنما

صفحہ ۸ سے آگے

ہوگا۔ اردو زبان اور مسلمانوں کے تمام تہذیبی ورثہ کی حفاظت بھی اسی طریقے سے ممکن ہے۔ مسلمانوں کے لیے یہ بات واضح ہونی چاہیے کہ غیر مسلم اکثریت کے ساتھ ان کی زندگی تو دیۂ تقدیر بن چکی ہے، وہ چاہیں یا نہ چاہیں ان کو اس ملک میں اسی حال میں رہنا ہے، دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کی طرح وہ اس ملک کی آبادی کا ناقابلِ انکار حصہ ہیں، یہی قدرت کا فیصلہ ہے اور اسلامی علوم کے ایک طالب علم کی حیثیت سے یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ قدرت کا یہ فیصلہ عظیم امکانات کا حامل ہے، بشرطیکہ مسلمان اپنے اندر وہ صفت پیدا کریں کہ ان کا مذہب جس سے متصف ہونے کی انھیں دعوت دیتا ہے، مسلمانوں کو حیرانی اور سراسیمگی کے عالم سے باہر نکل آنا چاہیے اور ایک محبِ وطن مسلمان کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنا چاہیے، اپنی بستی اور اپنے محلّے کے تمام غیر مسلموں سے ان کے خوشگوار تعلقات ہونے چاہیے، مسلمانوں کے خلاف بعض غیر مسلموں کا متعصبانہ رویہ معلوم، لیکن مجھے یہ بات کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ مسلمان بھی اپنے مسلمان ہونے کی ذمہ داریوں کو اس ملک میں ادا نہیں کر رہے ہیں، کیا ہمارے اعمال و کردار میں وہ خوبصورتی پیدا ہوگئی ہے، اسلام نے جس کا ہم سے مطالبہ کیا ہے کیا ہمارے اندر وہ اخلاقی خصوصیات موجود ہیں جن کا تجربہ کر کے برادرانِ وطن یہ محسوس کریں کہ مسلمان ایک شریف انسان اور بہتر پڑوسی اور اچھا شہری ہوتا ہے، اس کا پڑوسی ہونا محلّہ کے لوگوں کے لیے اطمینان کی بات ہوتی ہے، اس کو اپنے کارخانہ میں اور اپنی کمپنی میں ملازم رکھنا کارخانہ اور کمپنی کی ترقی کی ضمانت ہوتی ہے، کیوں کہ وہ دوسروں سے زیادہ فہیم، مخلص، محنتی، کارگزار اور امانت دار ہوتا ہے۔ دوسروں کے تعصب سے انکار نہیں لیکن کیا ہم مسلمانوں نے خدمت، ایثار اور قربانی اور اخلاقی بلندی اور قابلیت کا کوئی نقش قائم کیا ہے؟ ہم مسلمانوں کا حال بحیثیت مجموعی اقبال کے اس شعر کے مرادف ہے:

جس کو آتا نہیں دنیا میں کوئی فن تم ہو
نہیں جس قوم کو پروائے نشیمن تم ہو

کاش کہ ایسا ہوتا کہ برادرانِ وطن کے سامنے مسلمانوں کی بہت اچھی تصویر ہوتی، وہ سمجھتے کہ مسلمان بے ایمانی اور کام چوری نہیں کر سکتا ہے، انصاف اور سچائی کا راستہ اسے پسند ہے، انسانی اور روحانی اقدار کے اعتبار سے وہ دوسروں سے بلند اور زیادہ ممتاز ہے، وہ مسجد میں عبادت بھی کرتا ہے اور ایمان داری کے ساتھ کام کرنے کو بھی عبادت کا درجہ دیتا ہے، اسے تعلیم اور ہنرمندی سے شدید شغف ہے، وہ کمزوروں کا مددگار اور غریبوں کا غم خوار ہوتا ہے، وہ شریف اور تعلیم یافتہ ہوتا ہے ۔ وہ مذہبی تنگ نظری سے دور ہوتا ہے اور تمام انسانوں کو خدا کا کنبہ سمجھتا ہے، لیکن اس کے ساتھ اسے اپنی مذہبی شناخت پر اصرار بھی ہے اور وہ اپنے مذہب کو اپنے ہم وطنوں کے لیے سوغاتِ نجات بھی سمجھتا ہے اور مناسب طریقہ سے اس سوغات کو پیش بھی کرنا چاہتا ہے اور اس کے لیے وہ ہندستان کی تمام علاقائی زبانوں میں اپنا مذہبی لٹریچر پیش کرتا ہے اور وہ الیکشن کے موقعے پر حکومت میں ان لوگوں کو برسرِ اقتدار لانے کی کوشش کرتا ہے جو منصف مزاج ہوں اور مذہبی تنگ نظری سے دور ہوں۔

مولانا آزاد کا جو اقتباس اوپر اس مضمون میں نقل کیا گیا ہے وہ صحیح ترین سیاسی راستہ ہے جو اسلام کے مطالعہ پر مبنی ہے اور گرد و پیش کے حالات کے گہرے تجزیہ کا حاصل ہے، اس پیغام کو عام کرنے کی ضرورت ہے اور غیر مسلموں سے رابطہ کو مضبوط کیے بغیر اور انفرادی اور اجتماعی سطح پر مذاکرات شروع کیے بغیر یہ کام ممکن نہیں ہے۔ مذاکرات کے کلچر کو فروغ دینے کی ضرورت ہے تاکہ غلط فہمیاں دور ہو سکیں۔ ہندستان کا دستور بہت اچھا دستور ہے۔ اسی دستور کی روح ہے جس کی بدولت دیر سے ہی مولانا آزاد کے نام سے اردو کی ایک یونیورسٹی اس ملک میں قائم ہو گئی، اسی دستور کی روح سے اردو زبان کو اس کا جائز حق ملے گا، اس ملک میں مولانا آزاد کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ یہ بات اکثریت کے سمجھنے کی ہے کہ اقلیت کو ان کے جائز حقوق سے محروم کرنا خود ہندستان کے مفاد میں نہیں ہے۔ یہ وہ اقلیت ہے جس کے اقلیم حکمرانی میں دنیا کا وسیع رقبہ اور سیال سونے کا دریا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اس ملک میں دیر سویر باہمی رواداری کی فضا عام ہوگی، تلخیوں اور کدورتوں کا خاتمہ ہوگا کیوں کہ اس کے بغیر ہندستان کی ہمہ جہت ترقی ممکن نہیں ہے۔ فیض احمد فیض کی طرح ہمیں بھی انتظار ہے:

ہم کہ ٹھہرے اجنبی اتنی مداراتوں کے بعد
پھر بنیں گے آشنا کتنی ملاقاتوں کے بعد
کب نظر میں آئے گی بے داغ سبزے کی بہار
خون کے دھبے دھلیں گے کتنی برساتوں کے بعد

●●●

مولانا آزاد - ایک عظیم رہنما

پروفیسر محسن عثمانی (شعبۂ عربی سی آئی ای ایف ایل، حیدرآباد)
E-mail: profmohsinusmani@gmail.com

ہندوستانی مسلمان ایک ایسی ملت کا نام ہے، جس کا ماضی صبرآزما اور درخشاں رہا ہے۔ آئندہ کے بارے میں کوئی بات وثوق سے نہیں کہی جاسکتی ہے۔ اس کا انحصار اس پر ہے کہ مسلمان ایک زندہ قوم ہونے کا ثبوت دیتے ہیں یا نہیں۔ ماضی گذر گیا، مستقبل پردۂ غیب میں ہے جو کچھ ہمارے بس میں ہے وہ حال ہے اور حال میں صحیح سمت میں اور صحیح انداز میں کوشش کرنے پر روشن مستقبل کا انحصار ہے۔ صحیح سمت میں اور صحیح انداز میں کوشش کس طرح کی جائے اس کا انحصار دو چیزوں پر ہے، ایک یہ کہ اپنے حالات اور گرد وپیش سے متعلق مکمل شعور اور آگہی اور دوسرے اپنے مذہب کی روح سے مکمل واقفیت۔ اس کے بعد جو چیز باقی رہ جاتی ہے وہ ہے اس شعور اور اس واقفیت کی روشنی میں مستقبل کی منصوبہ بندی۔

جہاں تک حالات کا تعلق ہے تو اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہندوؤں کی بعض احیائی تحریکوں نے مسلمانوں کو معاشی، سیاسی، ثقافتی اور تعلیمی اعتبار سے پس ماندہ رکھنے کا تہیہ کر رکھا ہے۔

یہاں یہ بات ملحوظ رکھنی چاہئے کہ جب ہم ہندوؤں کی احیائی تحریکوں کا ذکر کرتے ہیں تو اس سے ہماری مراد پوری ہندو قوم نہیں ہوتی ہے ہندو قوم کی اکثریت احیائی ذہنیت نہیں رکھتی اور تمام ہندو مسلمانوں سے نفرت نہیں کرتے ان کی اکثریت سیکولر ذہنیت رکھتی ہے یعنی وہ ذہن رکھتی ہے جو مولانا آزاد کے دوست جواہر لال نہرو کا ذہن تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ سیاست کے نشیب و فراز میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ فرقہ پرستی کا ذہن رکھنے والے حکومت میں آجاتے ہیں۔ ہندوؤں کے معتقدات اور سیاسی نظریات میں بہت فرق اور تفاوت پایا جاتا ہے، زیادہ تر ہندو اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ ہندوستان کی سرزمین مختلف نسلوں، تہذیبوں اور مذہبوں کے قافلے کی منزل رہی ہے، سیکڑوں سال سے ہندوستان اس سانچے میں ڈھل چکا ہے اور اس سانچے کو نہ توڑا جاسکتا ہے اور نہ بدلا جاسکتا ہے، صدیوں سے ہندوستان کی تقدیر میں یہی رنگارنگی لکھ دی گئی ہے، ہندوؤں کی ایک اقلیت نے اس حقیقت کو نہیں سمجھا جس طرح سے مسلمانوں کی ایک اقلیت نے اس صورت حال سے خود کو ہم آہنگ نہیں کیا۔ حال کے اس مجمل اور مختصر تجزیے کے بعد اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسلام کی روح ان حالات میں کیا رہنمائی کرتی ہے اور اس تہذیبی اور مذہبی بوقلمونی میں ہندوستانی مسلمانوں کو کیا پیغام دیتی ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ مولانا آزاد کی بصیرت نے ان حالات میں اسلام کی روح کو سمجھتے ہوئے اور ہندوستان کے مخصوص مزاج کو ملحوظ رکھتے ہوئے سب سے بہتر سیاسی رہنمائی کی ہے اور یہ رہنمائی مولانا آزاد کی ایک تقریر میں زیادہ صاف نظر آتی ہے، مولانا آزاد کہتے ہیں:

"میں مسلمان ہوں اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان ہوں، اسلام کی تیرہ سو برس کی شاندار روایتیں میرے ورثہ میں آئی ہیں، میں تیار نہیں کہ اس کا چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی ضائع ہونے دوں۔ اسلام کی تعلیم، اسلام کی تاریخ، اسلام کے علوم وفنون، اسلام کی تہذیب میری دولت کا سرمایہ ہے اور میرا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کروں، بحیثیت مسلمان ہونے کے میں مذہبی اور کلچرل دائرے میں ایک خاص ہستی رکھتا ہوں اور میں برداشت نہیں کرسکتا کہ اس میں کوئی مداخلت کرے۔ لیکن ان تمام احساسات کے ساتھ میں ایک اور احساس بھی رکھتا ہوں، اسلام کی روح مجھے اس سے نہیں روکتی، وہ اس راہ میں میری رہنمائی کرتی ہے۔ میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندوستانی ہوں، میں ہندوستان کی ایک اور ناقابل تقسیم متحدہ قومیت کا ایک عنصر ہوں، جس کے بغیر اس کی عظمت کا ہیکل ادھورا رہ جاتا ہے، میں اس کی تکوین کا ایک ناگزیر عامل ہوں، میں اس دعوی سے کبھی دست بردار نہیں ہوسکتا۔"

(خطبات آزاد مرتبہ شورش کاشمیری)

کیا ہندوستانی مسلمانوں کے لیے یہ صحیح ترین رہنمائی نہیں ہے جو اسلام کی روح سے واقفیت کے ساتھ حالات کے شعور اور تجزیے پر مبنی ہے، کیا آج کے حالات میں ایک محب وطن مسلمان کا بعینہ یہی موقف نہیں ہونا چاہیے؟

اگر مولانا آزاد کی تقریر کا یہ اقتباس اہم ہے تو اس کی اہمیت کا احساس کتنے لوگوں نے کیا ہے، یہ اقتباس اس قابل ہے کہ خوبصورت طریقے سے اسے لکھوایا جائے، چھپوایا جائے آسمان سے برسایا جائے اور گھروں میں اور ڈرائنگ روم میں دیواروں پر فریم کرواکے اسے آویزاں کیا جائے تاکہ صحیح راستہ کا تصور ذہن اور دماغ میں واضح رہے اور پورے طور پر راسخ ہوجائے۔ نہ صرف یہ کہ تمام مسلمانوں کا ذہن بن جائے بلکہ تمام مسلمان اسی ذہن وفکر کے داعی اور علم بردار بن جائیں اور رواداری اور شرافت کے اس پیغام کو غیر مسلموں تک بھی پہنچائیں اور اس لیے کہ اس راستے سے ہٹ کر جو بھی راستہ ہوگا وہ ملک اور ملت دونوں کے باعث نقصان

(بقیہ صفحہ ۷ پر)

یہاں یہ بات ملحوظ رکھنی چاہئے کہ جب ہم ہندوؤں کی احیائی تحریکوں کا ذکر کرتے ہیں تو اس سے ہماری مراد پوری ہندو قوم نہیں ہوتی ہے، ہندو قوم کی اکثریت احیائی ذہنیت نہیں رکھتی اور تمام ہندو مسلمانوں سے نفرت نہیں کرتے ان کی اکثریت سیکولر ذہنیت رکھتی ہے یعنی وہ ذہن رکھتی ہے جو مولانا آزاد کے دوست جواہر لال نہرو کا ذہن تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ سیاست کے نشیب وفراز میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ فرقہ پرستی کا ذہن رکھنے والے حکومت میں آجاتے ہیں۔ ہندوؤں کے معتقدات اور سیاسی نظریات میں بہت فرق اور تفاوت پایا جاتا ہے، زیادہ تر ہندو اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ ہندوستان کی سرزمین مختلف نسلوں، تہذیبوں اور مذہبوں کے قافلے کی منزل رہی ہے، سیکڑوں سال سے ہندوستان اس سانچے میں ڈھل چکا ہے اور اس سانچے کو نہ توڑا جاسکتا ہے اور نہ بدلا جاسکتا ہے، صدیوں سے ہندوستان کی تقدیر میں یہی رنگارنگی لکھ دی گئی ہے۔

مدیر: اطہر فاروقی | Editor: Ather Farouqui
شریک مدیر: محمد عارف خاں | Joint Editor: Mohd. Arif Khan
پرنٹر پبلشر: شاہد خاں | Printer, Publisher: Shahid Khan
مطبوعہ: ثمر آفسٹ پرنٹنگ پریس، دہلی
Printed at: Samar Offset Printing Press, Delhi
مالک انجمن ترقی اردو (ہند)، اردو گھر، ۲۱۲-راؤز ایونیو، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲
Proprietor: Anjuman Taraqqi Urdu (Hind)
Urdu Ghar, 212-Rouse Avenue, New Delhi-110002
قیمت (فی شمارہ): تین روپے، سالانہ: ۱۲۵ روپے (بیرونی ممالک: آٹھ امریکن ڈالر)
Subscription: (Per Issue): Rs. 3/-, Yearly: 125/-
(Foreign Countries: US $ 8)
http://www.atuh.org. Phones: 23237212, 23237214

ادارے کا مضمون نگاروں سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے (ادارہ)